از جناب وحید الدین خان صاحب (اعظم گڑھ)

علم و معرفت میں فرق

"پچاس سونے والے بہہ گئے" ——— یہ خبر ایک مرتبہ اخبار میں چھپی۔ خبر میں ایک مقام پر بارش اور طوفان کی تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس ضمن میں کہا گیا تھا کہ پانی ریلوے لائن کے اوپر تک پہنچ گیا اور پچاس سونے والے بہہ گئے۔

یہ خبر کچھ عجیب سی تھی۔ ذہن نے جاننا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی اخبار دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اصل میں خبر یہ تھی "پچاس سلیپر بہہ گئے"۔ یہی الفاظ اردو اخبار میں ترجمے کی غلطی سے "سونے والے" بن گیا۔ سلیپر (SLEEPER) کے لفظی معنے بے شک سونے والے کے بھی ہیں۔ مگر اس خبر میں ظاہر ہے کہ یہ لفظ ریلوے لائن میں استعمال ہونے والے اس لکڑی کے کندے کے لئے تھا جس کے اوپر لوہے کی پٹڑیاں بچھائی جاتی ہیں نہ کہ سونے والے آدمی کے لئے۔

اس قسم کی غلطیاں کتنی ہی بار آپ کے سامنے آئی ہوں گی۔ ان غلطیوں کا سبب ہمیشہ علم کی کمی ہوتا ہے اور ان سے بچنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آدمی علم حاصل کرے۔ مگر غلطیوں کی ایک اور قسم اس سے زیادہ سنگین قسم ہے جس کا تعلق علم سے نہیں معرفت سے ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لئے صرف صاحب علم ہونا کافی نہیں بلکہ حقیقت آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص معرفت کی دولت سے محروم ہو وہ محض علم کی بدولت ان غلطیوں سے مامون نہیں رہ سکتا۔

معرفت کیا چیز ہے اور علم و معرفت میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک نہایت نازک سوال ہے اجمالی طور پر ہم میں سے ہر شخص اس فرق کو سمجھتا ہے۔ مگر متعین تعریف کرنی ہو تو کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تاہم سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا۔ مثال کے طور پر "واشنگٹن ایک شہر ہے" یہ ہم سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن اگر کسی وقت یہ واقعہ پیش آئے کہ ایک شخص رات کے وقت بے خبر سو رہا ہو اور اسی حالت میں کسی تیز رفتار سواری کے ذریعہ آہستگی کے ساتھ اس کو دور لے جا کر ایک مقام پر اس طرح اتار دیا جائے کہ جب آنکھ کھلے تو وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں پائے تو اس کے لئے یہ سمجھنا یقیناً

ناممکن ہوگا کہ یہ واشنگٹن ہے۔ جہاں وہ اس وقت اپنے آپ کو پا رہا ہے۔ اس کے برعکس یہی واقعہ اگر جانے پہچانے شہر میں پیش آئے تو ہم میں سے ہر شخص پہلی نظر میں سمجھ جائے گا کہ وہ کہاں ہے — اس مثال میں آپ جاننے اور پہچاننے یا علم اور معرفت کا فرق آپ بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔

معرفت، علم کی روشنی ہے۔ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے۔ اگر سرے سے روشنی نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر روشنی موجود ہو مگر کم ہو۔ تو اسی کے بقدر کم دکھائی دے گا۔ جتنا روشنی میں کمی ہے۔ اس اعتبار سے معرفت حاصل ہونے اور معرفت حاصل نہ ہونے کے ہزار درجے بن جاتے ہیں۔ میں چند مثالوں سے اس کو واضح کروں گا۔

۱۔ کیڑے مکوڑے (INSECTS) ہماری ایک جانی بوجھی حقیقت ہیں یہ نہایت کثرت سے انڈے بچے دیتے ہیں اور ان کے اندر بڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ ایک بھڑ کو اگر مسلسل زندہ رہنے اور نشوونما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی مانند جسامت حاصل کر سکتی ہے۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے کیڑوں کی ہزاروں صورتیں اگر شیر اور بھیڑیئے کی طرح بڑی ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیں۔ تو زمین پر انسان کے لئے زندگی گذارنا کس قدر مشکل ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے اس قسم کے پھیپھڑے نہیں رکھتے جیسے کہ آدمی رکھتا ہے۔ وہ خاص طرح کی ہوائی نالیوں (AIR TUBES) کے ذریعے سانس لیتے ہیں۔ جب کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ سانس کی نالیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا زیادہ بڑا نہیں ہونے پاتا۔ بڑھنے پر یہ حد بندی ان کو شیر کو اور بھیڑیئے کی جسامت حاصل کرنے سے روکے رہتی ہے۔ اگر یہ قدرتی روک موجود نہ ہوتی تو زمین پر انسان کے لئے قیام کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اگر دل کے اندر ایمان کی معرفت موجود ہو تو یہ واقعہ خدا کے وجود پر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے وہ اس کے لئے خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی عالم کریسی مارلیسن (MORRISON CRESSY) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عالم فطرت کا یہ نظم و نسق (ECONOMY) ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے کیونکہ:

ONLY INFINITE WISDOM COULD HAVE FORESEEN AND PREPARED WITH SUCH ASTUTE HUSBANDRY

یعنی صرف لامحدود عقل اتنے زیرک انتظام کو پیشگی تصور میں لا سکتی تھی اور اس کا اہتمام کر سکتی تھی۔

(ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء)

مگر معرفت سے محروم ذہن کے لئے یہی واقعہ بالکل برعکس مفہوم کا حامل بن گیا۔ جولین ہکسلے (J. HUXLEY)

اس زمانے کا بہت پڑھا لکھا آدمی ہے اس کی ایک کتاب ہے MAN IN THE MODERN WORLD یعنی انسان دورِ جدید میں۔ اس کتاب کے ایک حصے میں اس نے ارتقاء کے ذیل میں مذکورہ بالا واقعے کا ذکر کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور کیڑے مکوڑے کے فرق کو سمجھنے کے لئے کسی ارادۂ الٰہی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیڑے اور انسان دونوں ہی بعض سادہ اور ابتدائی جرثومۂ حیات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انسان کو مخصوص اسباب سے زیادہ ترقی کرنے کا موقعہ ملا ہے اس لئے وہ ذہن و دماغ رکھنے والی ہستی بن گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کو بعض مانع اسباب نے یہ مواقع فراہم نہیں کئے۔ اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا چیز تھی جس نے کیڑوں کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ اس کا جواب کیڑوں کے سانس لینے کے طریقے (BRERTHING MECHANIBM) میں چھپا ہوا ہے۔ زمین کیڑوں نے سانس لینے کے لئے ہوائی ٹیوب کا طریقہ اپنایا ہے جس کو حیاتیاتی اصطلاح میں (TRACHENE) کہتے ہیں اندر جاکر اس نالی کی نہایت چھوٹی چھوٹی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ جن کو صرف خوردبین کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے یہی نالیاں گیسوں کو جسم کے اندر نسیج (TISSES) تک لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان اور دیگر جانداروں میں دہرا طریقہ پایا جاتا ہے یعنی گیسیں پھیپھڑے سے ہو کر خون کی نالیوں تک پہنچتی ہیں۔ گیسوں کے نفوذ و انتشار کا قانون کچھ ایسا ہے کہ نالیوں کے ذریعے سانس لینا چھوٹے کیڑوں کے لئے تو بہت آسان رہتا ہے۔ مگر جسامت کے بڑھنے کے ساتھ وہ مشکل ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ چوہیا کے بقدر جسامت حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ نالی ناقابلِ استعمال ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا کبھی دوسرے ریڑھ دار جانوروں کے لحاظ سے اوسط درجے کی جسامت بھی حاصل نہ کر سکا۔"

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہی سبب اس بات کا ہے کہ کوئی کیڑا کبھی ذہین نہیں بنا۔ ایک خاص جسامت میں محدود ہونے کی وجہ سے کیڑوں کو بہت کم اعصابی ریشے درکار ہوتے ہیں۔ جب کہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجے کی جسامت ہی میں پایا جاتا ہے۔ اب چونکہ کیڑے اس درجے کی جسامت تک نہیں پہنچتے اس لئے وہ اعلیٰ ذہانت کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔

دیکھئے۔ ایک ہی واقعے کا علم ایک شخص کے لئے کائنات میں ایک ذہین تخلیقی ارادے کی موجودگی کا ثبوت بن گیا اور اسی واقعے سے دوسرے شخص نے یہ پہلو نکال لیا کہ موجودات کی توجیہہ کے لئے کسی تخلیقی ارادے کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے بغیر ہی ہم تمام موجودات کی توجیہہ کر سکتے ہیں۔ علم کی حد تک دونوں شخص یکساں ہیں۔ مگر

معرفت کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

۲۔ انجیل کا ایک فقرہ ہے :

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے"

متی ۵ : ۱۳

اس فقرے میں دراصل بنی اسرائیل کے آخری نبی نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے اہل دنیا کے لئے روشنی کا ذریعہ تھے۔ تمہاری حیثیت ہادی اور رہنما کی تھی۔ مگر تم نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنا مقام کھو دیا۔ اور اس طرح خود ہی اپنے کو اس کا مستحق بنا لیا۔ کہ دوسروں سے تمہیں ذلیل کیا جائے

مگر اس قانونِ الٰہی کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک امریکی ماہر کیمیا (ELMER W. MAURER) نے اس کی عجیب و غریب تاویل کی ہے۔ وہ ایک کیمیا داں ہے۔ اس لئے اس نے علم کیمیا کی روشنی میں اس کو دیکھا تو اس کا ذہن ایک اور ہی سمت چلا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ "تحقیق کے بعد میں اصل راز کو پا گیا"

"وہ یہ کہ رومی ارضِ مقدس کے رہنے والوں سے نمک بطور محصول وصول کرتے۔ اہل فلسطین کو نمک کی سب سے زیادہ یافت بحیرۂ مردار یا بحیرۂ نمک سے ہوتی۔ یہ محصول اتنے ظالمانہ تھے کہ لوگ نمک میں ریت وغیرہ کی آمیزش کرنے پر مجبور تھے۔ حکومت اس نمک کو پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں ڈال دیتی۔ جب نمک پانی میں گھل جاتا تو نمکین پانی اوپر سے نکال لیا جاتا اور ملاوٹی مادہ ناقابلِ تحلیل ہونے کی وجہ سے تہ نشین ہو کر حوض میں رہ جاتا۔ اس طرح نمک نے اپنا ذائقہ کھو دیا تھا۔ وہ اب نمک باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اسی قابل تھا کہ پاؤں کے نیچے روندا جائے"

وہ مزید لکھتا ہے :

"یہی ایک طریقہ نہیں تھا جس سے نمک اپنا ذائقہ کھو دیتا۔ بحیرۂ مردار (READ SEA) کی سطح کا پانی دیگر اجزاء کے ساتھ ۳۱ فیصد سوڈیم کلورائڈ۔ ۱۲ فی صد کیلشیم کلورائڈ اور ۴۷ فی صد میگنشیم کلورائڈ رکھتا ہے۔ کیلشیم اور میگنیشیم کلورائڈ ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت رکھتا ہے۔ اور اس بنا پر جب نمک کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو اسے تحلیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ناخوشگوار آمیزہ تیار ہو جاتا ہے۔ رواج تھا کہ وہ لوگ اس قسم کے نمک کے لئے بڑے بڑے ذخائر ان گھروں میں محفوظ کر لیتے جن کا فرش مٹی کا ہوتا۔ بعض اوقات

زمین کے ساتھ نمک کی جو نہیں بیٹھ جاتیں وہ نمی کی وجہ سے خراب ہو جاتیں چونکہ یہ ذخیرہ نمک ملا ہوا ہونے کی وجہ سے زرخیز زمینوں کے لئے مضر ہوتا تھا۔ اس لئے کوئی شخص بھی اسے کھیت میں پھینکنے کی اجازت نہ دیتا۔ اس بنا پر اسے صرف گلیوں ہی میں پھینکا جاتا۔ جہاں چلنے والے لوگ اسے اپنے پاؤں کے نیچے روندتے۔"

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE

EDITED BY, JOHN CLOVER MONSMA

(N.Y. 1958) P. 205

انجیل کے فقرے کی یہ توجیہہ ظاہر ہے کہ لال بجھکڑ کی روایتی کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو بجائے خود صحیح ہے اور نہ وہ متعلقہ فقرے پر کسی طرح منطبق ہوتی۔ مگر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے ایسی بچگانہ غلطی کا ارتکاب صرف اس لئے کیا کہ اس نے سائنس کا علم تو حاصل کیا تھا مگر دین کی حقیقتوں سے وہ نا آشنا تھا۔ وہ اس نمک سے واقف تھا جو علم کیمیا میں زیر بحث آتا ہے اور لیبارٹری میں جس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ "نمک" کی ایک اور قسم ہے جس سے دل و دماغ کو چاشنی حاصل ہوتی ہے جس سے زندگی میں خدا پرستی کا ذائقہ ہوتا ہے "نمک" کا لفظ دیکھ کر اس کا ذہن کیمیائی نمک کی طرف چلا گیا اور اپنے معروف نمک کے مطابق اس نے ایک تشریح کر ڈالی۔

اس کے باوجود اس کیمیا دان کو اپنے تصور پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اس کے بعد لکھتا ہے:

"یہ صرف ایک نمونہ ہے جس سے ثابت ہے کہ بائبل اپنی جزوی تفصیلات تک میں سائنسی طور پر بالکل صحیح ہے۔" (صفحہ ۲۰۵)

۳- ایک صاحب جو پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں انہوں نے ریسرچ میں اپنے مقالہ کے لئے اسلام کے معاشی نظریات (THE ECONOMIC DOCTRINES OF ISLAM) کا عنوان لیا۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنے مقالے کے ایک حصے کو تیار کرنے کے لئے انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ اسلام نے پیدائش دولت کے کن وسائل کی طرف پیروؤں کو متوجہ کیا ہے۔ اس مقصد سے انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا۔ تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں تو بالکل لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا معاملہ ہے پیدائش دولت کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس کی طرف انہیں کتاب الٰہی میں "اشارہ" نہ مل گیا ہو۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی بنیاد کیا تھی۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن مجید میں موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کے جو واقعات ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا:

فاوقد لی یا ھامان علی الطین فاجعل لی صرحا — اے ہامان ! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لئے ایک بلند عمارت
لعلی اطلع الی اللہ موسیٰ (قصص) — بنا کہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں ۔
اس آیت کو پڑھتے ہی موصوف اچھل پڑے ۔ انہوں نے کہا : یہ تو نزابیاتی صنعت CERAMIC INDUSTRIES کی تعلیم ہے حالاں کہ ظاہر ہے کہ اس فقرے کا نزابیاتی صنعتوں کے قائم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں وہ تو صرف فرعون کے نمرد کو بتا رہا ہے جو اس نے خدا کے نبی کے سامنے ظاہر کیا ۔

اسی طرح جہاں کہیں کوئی ایک لفظ مل گیا خواہ وہ سیاق میں بھی آیا ہو انہوں نے فوراً اس سے ایک معاشی مفہوم نکال لیا ۔

وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ (انعام) ان کے نزدیک مرغبانی اور پرند پروری کی تعلیم دینے والی آیت تھی واوحی ربک الی النحل (نحل) شہد کی مکھیاں پالنے اور شہد کی تجارت کرنے کے ہم معنی تھا ولباسھم فیھا حریر میں کرم پروری اور سلک انڈسٹری کی طرف اشارہ تھا ویصنع الفلک (ہود) جہاز سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا پیغام تھا ۔ وعلوا اساور من فضۃ (دہر) میں زیور سازی کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی تھی ۔ اسی طرح محقق "سرسری فہرست بندی" میں انہوں نے سو سے بھی زائد ایسی مصنوعات کا پتہ لگایا تھا جن کی طرف قرآن مجید میں "اشارے" کئے گئے ہیں حتیٰ کہ اس جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ قرآن سے جن صنعتی کاموں کی فہرست وہ بنا رہے ہیں اس میں اصنام ۔ تماثیل ۔ خمر اور صوامع جیسی چیزیں بھی شامل ہیں ۔

مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے بارے میں اس قرآنی استدلال کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو عربی الفاظ کے معانی کا علم تو تھا مگر قرآن کی حکمت سے وہ آشنا نہیں تھے اس لئے انہیں محسوس نہیں ہوا کہ جن آیات کے حوالے سے وہ اپنا استدلال کھڑا کر رہے ہیں ان آیات کا صنعت و تجارت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ استدلال صریح طور پر قرآن کی روح کو مجروح کر رہا ہے ۔

آپ کو یہ سن کر مزید حیرت ہو گی کہ ایک مخصوص حلقہ میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے ایک پروفیسر نے اس کو عظیم تصنیف (GREAT WORK) سے تعبیر کیا ۔ اور کیمرج یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر (DR. KRENKOW) نے لکھا ۔

THE WORK IS A DILIGENT AND SCIENYIFIO STUDY

یعنی یہ تصنیف محنت اور علمی مطالعہ کا ایک نمونہ ہے

۴ - مشہور حدیث جبرئیل کا ایک فقرہ ہے ۔

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (احاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے اس فقرہ کے بارے میں دریافت کیا۔
انہوں نے کہا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کی "رویت" کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی بندگی یہ سمجھ کر کی جائے کہ خدا جو علیم و بصیر ہے وہ یقیناً ہم کو دیکھ رہا ہوگا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

"احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے"[1]

جو لوگ حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں۔ انہوں نے خدا کو نہیں دیکھا اگر وہ دیکھتے تو ایسا ترجمہ نہ کرتے۔ یہ میرا جواب تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص خدا کا عینی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مشاہدہ صرف آخرت میں ممکن ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بندہ جب خدا کی یاد اور اس سے خوف و محبت کے جذبات میں غرق ہوتا ہے تو اس پر شبہ رویت کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان محض ایک نظریاتی نسبت نہیں ہے بلکہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی ربط ہے۔ عام انسانوں میں یہ ربط چھپا رہتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان کا یہ ربط اسی طرح ابھر آتا ہے جیسے دوسری فطری صلاحیتیں نکاس کا راستہ پانے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں اور ایسا نہ ہو تو دبی پڑی رہتی ہیں۔ بندہ جب اپنے آپ کو بالکل خدا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے انتہائی قریب آجاتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو امکانی ربط ہے وہ بالفعل قائم ہو جاتا ہے اس وقت خدا کا تصور آدمی کی فکر و نظر میں اس طرح سما جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جاتی ہے اس پر ایسے لمحات گزرتے ہیں جب خدا کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ وہ شوق اور اشتیاق کے شدید جذبات کے ساتھ خدا کی طرف لپکنے لگتا ہے۔ اس کو ایسی کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں نصیب ہوتی ہیں جیسے کہ وہ عین اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے اس کو ایسے سجدے نصیب ہوتے ہیں جب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے اور اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس کو ایسے اعمال کی توفیق ملتی ہے گویا کہ وہ عین خدا کے حضور میں ہے۔ اور اس کی خوشنودی کے لئے سرگرم ہے ——— یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندگی اپنے انتہائی معراج پر پہنچ جاتی ہے اس وقت بندہ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہونے کے باوجود اپنے احساس کے اعتبار سے خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ نہ دیکھنے کے باوجود خدا کو

---

[1] یہی مفہوم بعض دوسری روایات میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔
ان تخشی اللہ کانک تراہ (تم اللہ سے اس طرح ڈرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) فتح الباری جلد اوّل

دیکھنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں عبادت کے دو درجے بتائے گئے ہیں پہلا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندے کے قلب و روح پر خدا کا خیال اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری کی کیفیت طاری ہونے لگے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اس تصور کو جمائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اسی تصوّر کے تحت خدا کی عبادت کرے۔ اسی لئے حدیث کے پہلے ٹکڑے میں "رویت" کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں رویت کی نسبت خدا کی طرف۔ اس اعتبار سے فقرے کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے۔ انہوں نے اس حدیث میں عبادت کے دو "مراتب" مراد لئے ہیں۔ ایک "اعلیٰ" اور دوسرا اس سے "فروتر" "مرتبہ اعلیٰ یہ کہ بندہ ـــــ در مشاہدۂ معبود و حضور ذاتِ اقدس وے مستغرق باشد" اور اس سے فروتر مرتبہ" آگاہ بودن است از نظر الٰہی و علم وے تعالیٰ بحال بندہ" اس کے بعد انہوں نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

احسان عبادت کردن است خدا تعالیٰ را چناں کہ گویا می بینی اورا۔ پس اگر نیستی تو با این حال کہ گویا می بینی اورا۔ عبادت کن او را باین صفت کہ جانندہ باشی از یں کہ می بیند وے ترا دریں صورت۔

احسان کا مطلب خدا کی عبادت اس طرح کرنا ہے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے، پس اگر تمہاری یہ کیفیت نہ ہو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ تو تم اس طرح عبادت کرو کہ یہ خیال تمہارے ذہن میں موجود رہے کہ خدا تم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

اشعۃ اللمعات ج اول ص ٣٥

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

اشار فی الجواب الی حالتین ارفعھما ان یغلب علیہ مشاھدۃ الحق بقلبہ حتی کانہ یراہ بعینہ ... والثانیۃ ان یستحضر ان الحق علیہ یری کل ما یعمل

(فتح الباری ج ۱ ص ۱۱۱)

"احسان کیا ہے" کے سوال کا جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس میں دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ ان میں بلند حالت یہ ہے کہ عابد کے دل پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس خیال کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے کہ خدا اس سے باخبر ہے اور وہ اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں میں نے دیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ معرفت کس قدر ضروری ہے اگر معرفت یا دوسرے لفظوں میں اشیاء کی پہچان نہ پیدا ہوئی ہو اور آدمی کو ان حقیقتوں سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملا ہو تو محض علم کافی نہیں ہو سکتا۔ ظاہری معلومات رکھنے کے باوجود آدمی طرح طرح کی بے خبری میں مبتلا رہتا ہے وہ دیکھتا ہے۔ مگر

نہیں دیکھتا۔ وہ پڑھتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔

علم حقیقت میں وہی علم ہے جس کے ساتھ معرفت کی گہرائیاں شامل ہوں جس نے "غم" کا لفظ ڈکشنری میں دیکھا ہو مگر اس کو تڑپنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ غم کا مطلب نہیں جانتا۔ ایسا شخص بس ترجمہ کرنے والی مشین ہے جو ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں دہرا دیتی ہے۔ مگر نہیں جانتی کہ اس کا مطلب کیا ہے جس نے کتاب الٰہی میں لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ پڑھا مگر قرآن نے خود اس کے اوپر نازل ہو کر اس کے دل کے ٹکڑے نہیں کیئے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس آیت میں کون سی حقیقت بتائی گئی ہے جس نے اسلام کے معاشی قوانین پر عبور حاصل کر لیا مگر اس پر ایسی معاشی واقعہ نہیں گزرا کہ وہ ایک صاحب حاجت کو اپنی جیب سے پیسے دے۔ اور دوسری طرف اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں والذین یوتون ما آتوا وقلوبھم وجلۃ کی تفسیر جھلک رہی ہو اس وقت تک اسلام کی معاشیات سے بے بہرہ ہے جس نے نماز کے مسائل جان لیے۔ مگر نماز سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوئیں۔ نماز اس کے لئے خدا سے سرگوشی نہیں بنی وہ ابھی نماز سے ناآشنا ہے جس نے حدیث کی کتابیں ختم کر ڈالیں۔ مگر اس کے آنسوؤں نے کتاب کے اوراق نم نہیں کیئے، وہ حدیث کی حقیقت سے ناواقف ہے جس کو دنیا نے اسلام کے مقرر کا خطاب دیا ہو۔ اس کی تقریر اس وقت تک اسلامی تقریر نہیں بنتی جب تک کہ وہ خدا سے دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں نہ ملی ہو جس کو لوگ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں۔ اس کی تصنیف اس وقت تک اسلامی تصنیف نہیں ہے جب تک اس پر یہ حالت نہ گزری ہو کہ وہ بے قرار ہو کر سجدے میں سر رکھ دے اور کہے کہ خدایا! تو میرا قلم بن جا جس سے میں لکھوں تو میرا دماغ بن جا جس سے میں سوچوں۔

جاننے والو! جانو، کیونکہ تم ابھی نہیں جانتے۔ پڑھنے والو پڑھو۔ کیونکہ تم نے ابھی نہیں پڑھا۔